ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

ماخذ تحقیقی مجلہ

سید حسنین عباس شاہ
ریسرچ اسکالر/پی-ایچ-ڈی، شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر سعدیہ طاہر
اسسٹنٹ پروفیسر، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

افتخار عارف کی شعری کائنات

Syed Hussnain Abbas
Research Scholar, Ph.D Department of Urdu, Federal Urdu University, Islamabad.
Dr. Sadia Tahir
Assistant Professor, Federal Urdu University, Islamabad.

Iftikhar Arif's Poetic Universe

This article is about the intellectual tendencies of the famous poet Iftikhar Arif and the poetic themes that make up his poetic universe. Iftikhar Arif. For the last 57 years, he has been shining like a shining star on the literary horizon with full faith in his unique style and poetic ideas. Symbols, metaphors, and techniques, such as house, emigration, exile, and Karbala. Be it ghazal or poem, they know the art of drawing poetic aesthetics as well as the theory of life in both genres.

Keywords: *Iftikhar Arif, Intellectual tendencies, Poetic themes, Metaphors, House emigration, Exile, Karbala.*

عہد جدید میں اردو کی روایتی شاعری کی آبرو جن شعراء سے قائم ہے، افتخار عارف کا نام اس سلسلے کے معتبر ترین ناموں میں سے ایک ہے۔ افتخار عارف کی شعری کائنات اپنی سنجیدگی، مواد اور پختگی کے اعتبار سے معراج کمال پر ہے۔ ان کی سخن وری میں باطن کا کرب، محسوسات کی بازگشت، ندرت تخیل، ہجرت کا سوز و گداز، اذیت و عذاب دربدری، دعا اور خواب کا بانکپن پوری طرح عیاں نظر آتا ہے۔

مرنجاں مرنج، بذلہ سنجی، ملنساری، خلیق طبیعت، شگفتہ دلی، شرافت، نرم خوئی، وضعداری، رکھ رکھاؤ اور نفاست جیسے اوصاف سے آراستہ افتخار عارف لکھنوی تہذیبی زندگی کا عکس اور تمدنی آویزش کا پرتو نظر آتے ہیں۔

اللہ کی طرف سے ودیعت شدہ اخلاص و مروت ان کی روح میں تہہ نشین ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے ظاہری خدوخال اور اندازِ حلق میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

اتمامِ ذات کے تمام قرینے ان کی شخصیت اور فن میں باہم اس طرح یکجا ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔ وہ لکھنوی تہذیب کے پروردہ بھی ہیں اور اس عظیم تہذیبی اقدار کے علمبردار و امین بھی۔ شخصی انکساری، انسانی وضعداری اور گفتگو میں انتہا درجے کی ملائمت نے ان کی ذات اور فن کو کو ہر ادب شناس کے لیے عقیدت اور چاہت کا مرکز و محور بنا رکھا ہے۔ ان کی ذات کی کائنات اور دنیائے شعر و سخن میں یکساں بازگشت سنائی دیتی ہے جس سے ان کی صدائے سخنوری میں چاشنی، انفرادیت اور اختصاص پیدا ہوتا ہے۔

افتخار عارف کی شاعری کا مرکزی مصدر دعا ہے جس سے ان کے سخن کے دیگر تلاذمات پھوٹتے ہیں۔ عبدالعزیز ساحر کے الفاظ میں

> دعا، ان کی شاعری کی فکری تہذیب اور فنی جمالیات کی امین ہے۔ ان کے لہجے کے سارے رنگ اسی دعا کی بدولت یقین کا سراپا اوڑھتے ہیں تو ان کا استعاراتی رنگ، خواب و خیال کی تہذیب سے مملو ہو کر ایک ایسے جہان معنی کی تخلیق کرتا ہے جو فرد کے باطن کو یقین اور اثبات کی نئی اور تازہ کار فکری تعبیر سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔"(۱)

دعا فکر افتخار کی پاکیزگی کا سبب، خیال کی رعنائی اور حسن کلام کا وہ قرینہ ہے جو نہ صرف ان کی زندگی کے بے یقین لمحوں میں اعتبار کی روشنی پھیلاتی ہے بلکہ ان کے سخن کو باوقار قرینہ عطا کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے حبس زدہ اور گھٹن سے پر لمحات کو ہوا، تازگی اور مہکار بخشتی ہے۔

کوئی تو پھول کھلائے دعا کے لہجے میں
عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں

دلوں کو جوڑتی ہے سلسلہ بناتی ہے
ہر امتحاں میں دعا راستہ بناتی ہے

کسی گم گشتہ مسافر کی دعاؤں کا اثر
منزلیں گرد ہوئیں جادۂ ہموار کے پاس

ہو کے دنیا میں دنیا سے رہا اور طرف
دل کسی اور طرف دست دعا اور طرف

دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے لرزتا ہوں
کبھی دعا نہیں مانگی تھی ماں کے ہوتے ہوئے

درود پہلے بھی پڑھتا ہوں اور بعد میں بھی
اس لیئے تو اثر بھی دعا میں رہتا ہے

کوئی فغاں، کوئی نالہ، کوئی بکا، کوئی بین
کھلے گا باب مقفل دعا کیئے جائیں

مٹی اور خاک کا تصور افتخار عارف کی شعری دنیا کا بنیادی عنصر ہے۔ ان کی شخصیت میں اودھ (لکھنوی) کے تمدن کی جھلک نظر آتی ہے۔ حکمران اودھ نے جس تمدن کی بناڈالی تھی اس کی نرمی و نفاست اور خدوخال ان کی شخصیت اور فن سے جھلکتی ہے۔ اس مٹی اور خاک سے قلبی وابستگی کا عکس ان کی ظاہری شخصیت سے بھی نمایاں ہوتا ہے وہیں ان کا فن بھی اسی تمدنی مرکز کا غمار نظر آتا ہے۔ اس اس زمین سے جذباتی وابستگی اور اس زمین سے ہجرت کا قلق ان کی ذات میں امتزاج کی صورت میں اس طور ابھرا ہے جو ان کی گفتگو اور شاعری میں ایک اداس اور نمایاں تاثر لیئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس خاک اور خواب ناک دنیا سے نسبت کے شرف نے افتخار کو تہذیبی شعور سے مالا مال کیا ہے۔ خاک اودھ کی روشن صبحوں اور پر زوال شاموں کا عکس ان کی سوچ اور آنکھوں سے درد کی صورت رواں ہوتا ہے۔ پروین شاکر کے بقول

> "مٹی کی محبت عارف کے وجود کے گرد پورے چاند کے مہربان ہالے کی طرح ہمہ وقت رقصاں ہے۔"(۲)

مالک سے اور مٹی سے اور ماں سے باغی شخص
درد کے ہر میثاق سے روگردانی کرتا ہے

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

افتخار عارف کی شاعری میں لفظ "خاک اور مٹی" محض شاعرانہ علامت ہی نہیں بلکہ ایک طرزِ فکر و احساس کا نام ہے۔ مٹی کے تصور نے ان کے شعری اسلوب کے کئی پیکر تراشے۔ یہی مٹی کہ جہاں ان کے قدم استادہ ہیں، اپنے تعارف کا آخری حوالہ قرار پاتی ہے۔ وہ خود کو دست فنا میں سونپ دینے کو تیار ہیں مگر اس مٹی کے بارور رہنے کی دعا کرتے ہیں

مری زمیں میرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

خاک سے وابستگی نے ان کے انکسار ذات سے لے کر خیال اور خواب کی سرزمین پر مہر منور کی مانند کرنیں بکھیر دی ہیں۔ ان کرنوں کے عکس نے افتخار عارف میں مٹی کی محبت اس انداز سے راسخ کر دی ہے کہ وہ اپنی ذات پر مٹی کی محبت کو فرض اور اس کا قرض اتارنا واجب قرار دیتے ہیں

کبھی کھل کے لکھ جو گذر رہا ہے زمین پر
کبھی قرض بھی تو اتار اپنی زمین کا

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہ تھے

بس ایک خاک کا احسان ہے کہ خیر سے ہیں
وگرنہ صورت خاشاک دربدر رہتے

خاک میں شوکت و پندار انا ملتی ہے
اپنی مٹی سے بچھڑنے کی سزا ملتی ہے

میں تو خاک تھا کسی چشم ناز میں آ گیا ہوں تو مہر ہوں
مرے مہرباں کبھی اک نظر مرا سلسلہ بھی تو دیکھتے

مٹی ہیں سو مٹی ہی سے رکھتے ہیں سروکار
آتے نہیں خورشید مزاجوں کے اثر میں

جس مٹی سے افتخار عارف کا خمیر اٹھا اور جس تہذیب کے ہاتھوں ان کی پرورش ہوئی اس میں میر انیس کے سوز و گداز کی جھلک بھی ملتی ہے یگانہ کی اسلوب کی معنوی گہرائی بھی۔ وہ مجاز کی "صبح نو" سے طلوع ہونے والا آفتاب سخن بھی ہے اور اس کی آواز میں آتش کا طنطنہ، دبدبہ اور سرفروشانہ انداز بھی ہے۔ جس تہذیبی افتخار کی اس پر چھاپ ہے، وہ سلسلہ سخن کے اس انداز کی غماز ہے جس کا نقطۂ آغاز ناسخ سے ہوتا ہے۔ وہ سودا کی شعری روایت کے امین بھی ہیں اور امیر مینائی کی سخن معرفت کے نمائندہ بھی، دربدری کے عذابوں میں بھی اسلاف کی یہ روایتیں اس کی حرزِ جاں بنی رہیں۔ لکھنؤ کی خاک سے کراچی کی خاک تک اور قیام تک وہ حرمت خاک کے سفیر بن کر گھر نہ آنے کے باوجود عذاب سفر جھیلتے رہے لیکن مٹی کی محبت میں اس آشفتہ سر نے اپنے اوپر آنے والے ناواجب قرضوں کو بھی اتار دیا۔

جوہری کو کیا معلوم کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں
کیسی باس ہوتی ہے
جوہری کو کیا معلوم
جوہری تو ساری عمر پتھروں میں رہتا ہے
زرگروں میں رہتا ہے
جوہری کو کیا معلوم
یہ تو بس وہی جانے
جس نے اپنی مٹی سے
اپنا ایک اک پیماں
استوار رکھا ہو
جس نے حرفِ پیماں کا اعتبار رکھا ہو
جوہری کو کیا معلوم کس طرح مٹی میں کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے

افتخار عارف نے اپنی شاعرانہ علامتوں میں "گھر" اور گھر کے تصور سے جڑے پہلو مثلاً مکان، دربدری اور خانہ بدوشی کی علامتوں کو اس طور برتا ہے کہ یہ پہلو اور علامتیں ان ہی کے ساتھ مخصوص ہو کے رہ گئیں ہیں۔ ڈاکٹر رؤف امیر نے ان کے اس تصور کو اس زاویۂ نظر کے ساتھ دیکھا ہے۔

> "غزل کا یہ معروف موضوع افتخار عارف کے ہاں مستعار نہیں، تجربہ ہے۔ مکان اور گھر کا فرق جس طرح انہوں نے واضح کیا وہ انہی سے مخصوص ہے۔ قبل ازاں غالب نے اپنے ایک خط میں کچھ اس طرح کے الفاظ لکھے تھے کہ "میں جس مکان میں مقیم ہوں وہ گھر کا نہیں کرائے کا ہے"۔ لیکن افتخار عارف نے نبض دوراں پر ہاتھ رکھا ہے۔ کون ہے جو بے دردی، بے گھری کے مسلۂ سے دوچار نہیں۔"(۳)

یہ خاصہ بھی افتخار عارف کو ہی حاصل ہے کہ انہوں نے مختصر سی لفظی جست میں گھر اور مکان کے فرق کو اس طور سے پاٹا ہے کہ گھر اور مکان کا جدا جدا مفہوم طے ہو گیا ہے

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

افتخار عارف کے ہاں گھر محدود معنوں میں مٹی اور گارے سے تعمیر شدہ چار دیواری کا نام نہیں بلکہ سکون و عافیت، پیار و محبت اور آسودگی کے مرکز کا نام ہے۔ ان کی فکر عمیق میں گھر سکونت کی ایک محدود اکائی سے ماوراہو کر جہان کل کو مقام طمانیت سے پیوست کر کے گھر کے تصور کو آفاقی بنا دیتے ہیں

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ اک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

یہ اب کھلا کہ کوئی بھی منظر مرا نہ تھا
میں جس میں بس رہا تھا وہ گھر مرا نہ تھا

تمام خانہ بدوشوں میں مشترک ہے یہ بات
سب اپنے اپنے گھروں کو پلٹ کر دیکھتے ہیں

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

گوپی چند نارنگ نے افتخار عارف کے نظریہ گھر کو ان الفاظ میں سلیس انداز میں واضح کیا ہے۔

"گھر سے مراد کیا ہے؟ گھر گھر بھی ہے محدود معنی میں اور پوری دنیا بھی نس میں ہم رہتے ہیں یہ گھر عذابوں میں گھری بستی بھی ہو سکتا ہے اور شہر مذبذب بھی۔ یہ شاعر کا معاشرہ بھی ہو سکتا ہے جس سے وہ گہرے طور پر وابستہ ہے۔ شاعر اپنی زمین کو اپنا آخری حوالہ کہتا ہے اور دربدری کی دہائی بھی دیتا ہے۔"(۴)

افتخار عارف کی شاعری کا ایک اہم استعارہ خواب ہے جسے انہوں نے اپنے تخلیقی وفور اور قوتِ وجدانی سے اس طرح سے شعروں میں ڈھالا ہے کہ خواب کی رعنائی پیش نظر میں اپنی توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں خواب محض نیند کے محدود معانی میں نہیں رہتا اور نہ ہی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا ایک حوالہ رہتا ہے بلکہ فکر و خیال کے نت نئے رنگوں سے مزین تصویر ابھرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر کے بقول

"افتخار عارف کے ہاں خواب کی جمالیات اور اس کا معنوی پھیلاؤ خیال کے مختلف اور متنوع رنگوں میں سانس لیتا ہے۔ اسی لیئے ان کی غزل میں خواب کا منظر نامہ خوابیدگی کے پس منظر سے طلوع نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنوی اور فکری ہس منظر میں بیداری کے سارے رنگ و آہنگ موجود رہتے ہیں۔"(۵)

افتخار عارف کی شاعری خیال و خواب کے اس حسین تصور سے عبارت ہے جہاں باطنی سچائی خیال کی دلکشی کے سارے رنگ کشید کر کے آنکھوں میں تعبیر کے چراغ روشن کرتی ہے۔ جہاں خواب فکر کی روشنی سے منعکس ہو کر خواب کی تعبیر کے عوامل کو گرفت میں لے کر نئے رنگ بکھیرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر

"افتخار عارف کی کمٹمنٹ خواب سے طے پاتی ہے۔"(۶)

بس ایک خواب جس کی حدیں دسترس میں ہوں
وہ بھی نہ دے، پہ خواب فلک در فلک نہ دے

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

اک خواب دل آویز کی نسبت سے ملا کیا
جز دربدری اس در و دولت سے ملا کیا

یادوں سے اور خوابوں سے اور امیدوں سے ربط
ہو جائے تو جینے میں آسانی کرتا ہے

افتخار عارف خوابوں سے کٹ کر جینے کو سزا تصور کرتے ہیں، ان کی فکر کے مطابق خواب، نیند، سکوت اور جمود کی علامت نہیں بلکہ دعا، امید، تحریک، روشنی، تہذیب اور عزم نو کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ وہ بنیاد سحر کا آغاز خواب دیکھنے سے مشروط کرتے ہیں۔ حیات کے طویل سفر میں خواب کو زاد سفر خیال کرتے ہیں۔

یہاں کے لوگ اپنے خواب اپنے دل میں رکھتے ہیں
تمہارے شہر کی یہ اک ادا اچھی لگی ہم کو

اے راہ رو! کچھ تو خبر دو کہ ہوا کیا
خوابوں کا خزانہ بھی تو تھا زاد سفر میں

حجاب شب میں تب و تاب خواب رکھتا ہے
درون خواب ہزار آفتاب رکھتا ہے

آسمانوں پر نظر کر انجم و مہتاب دیکھ
صبح کی بنیاد رکھنی ہے تو پہلے خواب دیکھ

افتخار عارف زندگی میں خواب دیکھنے اور ان کے پر تعبیر ہونے کے احساس سے سرشار ہیں۔ وہ خواب کو امید کا استعارہ سمجھتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے خیال کی دنیا کے منظر دیکھنے والے ساتھی کو ان کی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی کے بقول

> "ہمارے ہاں اگر خواب کے لغوی معنی نیند اور محض نیند نہ ہوتے تو مجھے افتخار عارف کو خوابوں کا شاعر کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہوتی۔"(۷)

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

واقعہ کربلا انسانی تاریخ کا وہ الم ناک المیہ ہے جس نے مذہبی، سماجی اور تاریخی ہر حوالے سے ہر زمانے کو متاثر کیا ہے۔ اس المیہ نے ہمارے اردو ادب کو بالخصوص کئی حوالوں سے متاثر کیا ہے۔ عصری تناظرات میں کربلا کے مختلف پہلوؤں کو ادبی رنگ میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ میر انیس اور میر دبیر نے تو اس کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔ جدید شاعری میں کربلا کا استعارہ ایک نئی معنویت کے ساتھ پیش کرنے میں افتخار عارف کا جدا گانہ، شاعرانہ مقام ہے۔ اس استعارے کے استعمال سے افتخار عارف نے انسانی جرات، حریت اور جذبہ سرفروشی کی تجسیمی تشکیل کی ہے۔ دشت، مشکیزہ، پیاس، خیمہ، تیر، صحرا جیسے استعاروں سے وہ صدیوں کے فاصلے کو پاٹتے ہوئے اپنے عہد کے مسائل، تغیرات اور انقلابات اس معرکہ حق و باطل سے مربوط کرتے ہیں تو نہ صرف اس واقعہ کی فکری معنویت اجاگر ہوتی ہے بلکہ حق و باطل کے درمیان ازل سے جاری جنگ اور یزیدیت اپنے اصل روپ میں آشکار ہوتی نظر آتی ہے۔ افتخار عارف نے کربلا کے حوالے سے شاعری میں اپنے جولان طبع سے جو رنگ بکھیرے ہیں وہ دائمی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔

حسین تم نہیں رہے تمہارا گھر نہیں رہا
مگر تمہارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

وہی پیاس ہے وہی دہشت ہے وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

سپاہ شام کے نیزے پہ آفتاب کا سر
کس اہتمام سے پروردگار شب نکلا

افتخار عارف نے کربلا کا استعارہ اس خوبصورتی اور قرینے سے برتا ہے کہ یہ شعری رجحان ان کے شعری شناخت نامے کا ناگریز حصہ بن گیا ہے۔ اس سانحہ عظیم سے کسبِ فیض عقیدت کا مظہر تو ہے ہی مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ استعارہ ان کے شعری نظامِ فکر میں معنویت کے رنگ گھول کر تہذیبی میراث بن جاتا ہے۔ معنویت کا یہ

ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

رنگ عصر حاضر کی اقدار میں صداقت سچائی اور حریت فکر کی اساس بن کر ابھرتا ہے۔ اسی لیے فیض احمد فیض نے بجا طور پر کہا ہے

"افتخار عارف نے گذارش احوال واقعی کے لیے اس ماخذ سے بہت اثر آفریں اور خیال افروز کام لیا ہے۔"(۸)

وہ فرات کے ساحل پر ہوں یا کسی اور کنارے پر
سارے لشکر ایک طرح کے ہوتے ہیں
سارے خنجر ایک طرح کے ہوتے ہیں

خلق ہے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

میں جانتا تھا مرے قبیلے کی خیمہ گاہیں جلائی گی اور تماشائی
رقص شعلہ فشاں پر اصرار ہی کریں گے
میں جانتا تھا میرا قبیلہ بریدہ و بے ردا سروں کی گواہیاں لے کے آئے گا
پھر بھی لوگ انکار ہی کریں گے

اقبال کے بعد غالباً افتخار عارف ہی وہ منفرد شاعر ہیں جنہوں نے اس عظیم سانحہ کے نتائج، ثمرات اور مضمرات کو اپنے عہد کی روایات پر ساتھ منطبق کرنے کی کوشش کی۔

"اقبال قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں" کہہ کر زبانی حدود کو سمیٹ کر عصری تناظر میں قحط الرجال کا شکوہ کرتے ہیں تو افتخار عارف چراغ، ترکش، دریا، سپاہ، تیر مشکیزہ، پیاس، دشت، رن، اذان، غبار، ڈھال جیسے استعاروں سے کربلا کو فکری، معنوی، تہذیبی منظر نامے میں ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں۔ افتخار عارف کی اس عظیم سانحے کی تہذیب حاضر سے انسلاک کی سعی تمام پر انتظارِ حسین کا کہنا بجا ہے کہ

"افتخار عارف کی عقیدتی شاعری نے انیس کو ہضم کرنے کے بعد اس شعور سے رشتہ جوڑا ہے جس نے اقبال کی عقیدتی شاعری کے ساتھ ظہور کیا تھا۔"(۹)

لکھنوی تہذیب سے روحانی اور فکری وابستگی نے افتخار عارف کے تخلیقی وجدان سے گہری مناسبت پیدا کی ہے۔ ان کے ہاں کہیں کہیں احتجاج اور مزاحمت کا رویہ قافلہ بے سروسامانی، نیزے پر آفتاب کا سر گھمسان کا رن، مشکیزے اور تیر کا رشتہ، خاک پر سجدہ، روشنی سجدے میں ہے، نوک نیزہ پر تلاوت، راکب دوش پیمبر، ظالموں کا ڈر جیسی تراکیب کے استعمال سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس بارے میں گوپی چند نارنگ رقم طراز ہیں

> "واقعہ کربلا اور اس کے تعلیقات کا نئے انسانی مفاہیم میں استعمال یوں تو اوروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن افتخار عارف کے تخلیقی وجدان کو اس سے جو گہری مناسبت ہے نئی شاعری میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ ان کے یہاں یہ بات ان کے تخلیقی عمل کے بنیادی محرک کا درجہ رکھتی ہے۔"(۱۰)

افتخار عارف کی غزل کا ایک اور اہم موضوع ہجرت ہے۔ ان کی شاعری میں المیۂ ہجرت کا رنگ اور تصور ایک نئے زاویے سے طلوع ہوتا ہے۔ ان کی فکر و نظر میں ہجرت کا عمل زمانی قید سے سے ماوراہو کر ہجرتِ مدینہ، اور امام عالی مقام علیہ السلام کے مدینہ چھوڑنے کے اقدام سے جاملتا ہے۔ وہ ہجرت کی المیاتی فضا میں تاریخی، تہذیبی اور عصری رنگوں کی آمیزش سے ہجرت کی معنویت اجاگر کرتے ہیں۔

نتیجہ کربلا سے مختلف ہو یا وہی ہو
مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا

اک ہماری بھی امانت ہے تہ خاک
کیسے ممکن ہے کہ اس شہر سے ہجرت کریں ہم

ایک ہجرت اور ایک مسلسل دربدری کا قصہ
سب تعبیریں دیکھیں گے کوئی خواب نہیں دیکھے گا

ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہو گی ہم سے

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگ زمانہ ہیں ہم کیا ہماری ہجرت کیا

افتخار عارف نے ہجرت کی الم ناکی اور اس کے پہلوؤں کو فکر کی تمام تر توانائیوں کے ساتھ محسوس کیا ہے جس کا اظہار ان کی شاعری میں درد و کرب اور اضطراب کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہجرت کی شکل میں افتخار کے ہاں ایک ایسا مرکزی کردار ابھرا ہے جو ہجرت کے عذابوں میں گھرا ہوا دربدر اور نگر نگر کی خاک چھانتا ہے اور اسے کہیں پناہ نہیں مل رہی۔ وطن کی خاک سے دوری اور عزاب دربدری کا مفہوم خود افتخار عارف کی نظر میں یوں ہے

> "ہر وہ سفر جو اجنبی سرزمینوں کی طرف کیا جاتا ہے ہجرت نہیں ہوتی۔ ہجرت کسی آورش کی طرف سفر کو کہتے ہیں۔ ظلمت سے نور کی طرف سفر، شر سے خیر کی طرف سفر، حق سے باطل کی طرف سفر، ہجرت چراگاہوں کی تلاش میں، آسودگی کی تلاش میں مارے مارے پھرنے سے عبارت نہیں ہوتی۔"(۱۱)

افتخار عارف کا شعری جہاں دینی، تہذیبی اور متصوفانہ اسلوب سے مزین ہے۔ ان کی غزل اور نظم میں حمدیہ، نعتیہ اور متصوفانہ اشعار جہاں ان کی فکر کے متنوع پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں وہیں ان کی روایت اور اقدار سے جڑے رہنے کے رجحان کے علمبردار بھی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لہجے کا تاثر اور ان کی دینی طرزِ فکر باہم مربوط ہیں۔ انہوں نے دینی اور مذہبی تلمیحات و علامات سے ایسا جہان سخن تراش رکھا ہے جس کے مد مقابل سوائے اقبال کے کوئی اور نہیں ہے۔ ان کی فکر کی ضو، تصوف کے ضوفشاں ہالے بناتی ہے اور فضا کو پر تنویر کرتی ہوئی دائمی اجالوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

کسی اہل ہجر کی بد دعا ہے کہ خود سری کا قصور ہے
یہ جو بات بن کے بگڑ رہی ہے تو کوئی تو بات ضرور ہے

میں چراغ لے کے ہوا کی زد میں جو آ گیا ہوں تو غم نہ کر
میں جانتا ہوں کہ میرے ہاتھ پہ ایک ہاتھ ضرور ہے

آخیر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ افتخار عارف کی شاعری زندگی کی بولتی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہوئے اپنے لہجہ کی الگ پہچان بنائی ہے۔ ان کے لہجے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا اپنا منفرد اور پر اعتماد لہجہ

ہے ان کے کینوس کے نئے رنگ تازہ کاری اور موضوعاتی تنوع اس تجرباتی عمل کا ثمرہ ہے۔ ان کی شاعری اپنے فکری نظام اور فنی اہتمام کے باعث علیحدہ شناخت رکھتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۹، ص ۵۷

۲۔ پروین شاکر، چپ دریا، مشمولہ جواز افتخار، عبارات، لاہور، ص ۱۸۰

۳۔ رؤف امیر، اقلیم ہنر، افتخار عارف، شخصیت و فن، الوقار، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۶۱

۴۔ گوپی چند نارنگ، دیباچہ، مہر دو نیم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، طبع دوم، ۱۹۸۵، ص ۲۰

۵۔ عبدالعزیز ساحر، ڈاکٹر، پاکستانی ادب کے معمار، افتخار عارف شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۹، ص ۶۴

۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افتخار عارف کا فن، چہار سو، جولائی اگست، ۱۹۹۵، مدیر گلزار جاوید، فیض الاسلام، پرنٹنگ پریس راولپنڈی، ص ۱۵

۷۔ احمد ندیم قاسمی، افتخار عارف کا مجموعہ کلام "حرفِ باریاب" چہار سو، جولائی اگست، ۱۹۹۵، ص ۲۳

۸۔ فیض احمد فیض، پیش نامہ، مہر دو نیم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، طبع دوم، ۱۹۸۵، ص ۶

۹۔ افتخار عارف، کتاب دل و دنیا، دانیال، کراچی، ۲۰۱۲، ص ۱۶۹

۱۰۔ افتخار عارف، شعری شناخت کا حصہ، نئی معنیاتی جہاد، جواز افتخار، عبارات، لاہور، ۲۰۰۰، ص ۱۳۴

۱۱۔ www.hilal.gov.pk/hilal-urdu